۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۴۰

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۱۶)

شکاگو بہت بڑا شہر ہے۔ ہمارے بیٹے نعیم نے شکاگو بیچ ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ یہ ہائیڈ پارک کے علاقے میں واقع ہے اور مشی گن کی جھیل سے مشکل سے ایک فرلانگ ہوگا۔ چنانچہ جھیل سے بڑی تیز ہوا برابر آتی رہتی تھی اور جاڑے میں تو یہ عالم ہوتا تھا کہ بقول سودا' نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے۔ میں نے اکتوبر کے آخر میں ہی ایک لمبی اونی ٹوپی خریدلی تھی جو غالب کی کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی تھی۔ سخت ہوا یا سردی ہو تو اس کے اندر کے کونے باہر کرکے کان ڈھک لیا کرتا تھا۔ بیوی ویسے تو خوش تھیں مگر کبھی ان کے کان میں تکلیف رہتی تھی، کبھی پیر میں جس کے لئے برابر دوائیں کھاتی رہتی تھیں۔ ایک دن میں انھیں جھیل کے کنارے لے گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس جھیل میں جو سمندر معلوم ہوتی تھی (یہ ساڑھے تین سو میل لمبی اور ساٹھ میل چوڑی ہے اور امریکہ کے سینے پر ایک آویزے کی طرح لٹکی ہوئی ہے) پیر لٹکا کر بیٹھوں مگر بیوی کو پانی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے بچوں اور عورتوں اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا جو کنارے کی دیوار پر اچھل کود رہے تھے، مگر بیوی کا خوف نہ گیا۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی گئے تو شریفوں کی طرح ذرا دور دور اور لئے دئے رہے مگر ذرا تیز ہوا چلتی تھی تو جھیل کی یاد گھر بیٹھے آجاتی تھی۔

شکاگو میں یاد نہیں پڑتا کہ چاند نظر آیا ہو۔ کچھ تو شکاگو روشنیوں کا شہر ہے اور رات میں جدھر نکل جا[ئیے] سڑکوں پر تیز تیز روشنی اور عمارتوں کی کھڑکیو[ں سے] جھلکتی ہوئی کرنیں دور تک دکھائی دیتی ہیں کچھ [یہ بھی] تھا کہ چونکہ شہر کی فضا عموماً غبار آلود رہتی ہے اس لئے چاند کیسے نظر آتا، تاروں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شہر میں اول تو لاکھوں کاروں کے دھوئیں نے، پھر سیکڑوں چھوٹے بڑے کارخانوں کی چمنیوں نے فضا کی گندگی کا اچھا خاصا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے جس کے خلاف نوجوان اور شہریوں کی کمیٹیاں برابر آواز بلند کرتی رہتی ہیں اور موسم کے حال کے ساتھ فضا میں گندگی یعنی سلفر کے آکسائڈ اور کاربن مانو آکسائڈ وغیرہ کا شمار بھی بتایا جاتا ہے۔ شکاگو سے تیس چالیس میل باہر نکل جائیے تو یہ گندگی کم محسوس ہوتی ہے۔ نعیم ہمیں کئی دفعہ رات کو شہر کی رونق دکھانے لے گئے۔ ڈاؤن ٹاؤن یعنی (DOWN TOWN) میں تو ہر رات کو دن نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۸ روپے

مستقل نمائش لگی ہوئی ہے۔ یہاں بڑے دن کے زمانے میں ہر دکان پر پری خانے کا گمان ہوتا تھا اور ہر دفتر ایک رنگ محل نظر آتا تھا۔ سائنس کے میوزیم میں ہم نے کوئی بیس ملکوں کے بڑے دن کے پیڑ دیکھے۔ ہر ایک کی سجاوٹ نرالی تھی اور ہر ایک کا کرشمہ دامن دل کو کھینچ لیتا تھا۔ مجھے فرانس کے پیڑ کی سجاوٹ خاص طور سے پسند آئی۔ لیکن شکاگو میں ایسے علاقے بھی دیکھے جہاں لوگ مفلوک الحال معلوم ہوئے اور ہمارے دیار کی طرح سڑکوں پر کھڑے باتوں میں مصروف نظر آئے۔ یہ علاقے زیادہ تر کالے لوگوں کے تھے۔ ان میں سے بہت سے الکوہلزم (ALCOHOLISM) کے شکار معلوم ہوتے تھے۔ یہاں سے دو ایک دفعہ ایسے وقت گزرے کہ رات خاصی جا چکی تھی تو ہمارے خضر راہ چودھری محمد نعیم ہمیں پہلے سے آگاہ کر دیتے تھے اور گاڑی تیز چلاتے تھے، کیونکہ یہاں کسی کو روک کر اس سے سب کچھ چھین لینا، بہت عام بات ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا ہاں ایک دفعہ دن دہاڑے ایک بس میں ایک حبشی لڑکا جو بہت پیے ہوئے تھا اور جب بس جھٹکے سے چلی اور وہ گر پڑا تو میری بیوی پر گرا۔ انھوں نے قدرتی طور پر اسے دھکا دیا جس کی وجہ سے وہ فرش پر لڑھک گیا۔ بیوی سے تو وہ نہ الجھا مگر میرے ایک ساتھی جناب شادان ہندوی سے تیز لہجے میں بحث کرتا رہا اور ان کی جیب پر بھی ہاتھ ڈالا مگر اتنے سنئے میں تھا کہ شادان صاحب کا بیان ہے کہ معلوم ہوتا تھا جیب پر ہاتھ پھیر رہا ہے اور کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ ہم جیسے محتاط مسافروں کے لئے یہی تجربہ کافی تھا اور اس کے بعد ہم نے بس میں سفر بہت کم کیا۔ زیادہ تر کار سے جاتے تھے یا ٹیکسی لے لیتے تھے یا پھر ریل سے شاپنگ کو جایا کرتے تھے۔

شاپنگ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ضرورت کی کوئی چیز خریدنا ہوتی ہے تو پہلے ٹالتا رہتا ہوں، جب مجبوری سر پر آجاتی ہے تو نکلتا ہوں اور دو چار منٹ میں مطلوبہ چیز لے لیتا ہوں۔ دوسری عورتوں کی طرح میری بیوی کو شاپنگ سے عشق ہے۔ وہ دیکھنے کی خاطر بھی بازار جاتی ہیں اور خوب گھوم پھر کر چیز خریدتی ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اس دیکھ بھال کی وجہ سے چیز بھی اچھی ہوتی ہے، مگر کئی گھنٹے دکانوں کا چکر لگانے کے لئے اتنا وقت اور اتنا صبر کوئی کہاں سے لائے، نعیم میری طرح ہیں، وہ ایک چیز میں دیکھیں اور پسند کی چیز خریدیں۔ اس لئے میری بیوی نعیم کے بجائے فخری صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ خریداری کے لئے جانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ فخری شکاگو کے ایک کالج میں تعلیم کے استاد ہیں، ان کی بیگم بھی شاپنگ سے خاصا شغف رکھتی ہیں، فخری صاحب سنجیدہ سا چہرہ بنائے کوئی نہ کوئی فقرہ چست کرتے رہتے تھے جس کا وار ان کی بیگم پر ہوتا تھا۔ مگر وہ نہایت خضوع و خشوع سے شاپنگ میں مصروف رہتے تھے۔ میں یا تو تھک جاتا تھا یا کافی کے بہانے انخلا کا اعلان کرتا تھا۔

شکاگو میں ہندوستانی اور پاکستانی سب بڑی محبت سے پیش آئے۔ امریکن تو ویسے ہی خاصے گرمجوش ہوتے ہیں۔ شاعر ولیم بلنٹ اور ان کی بیوی مارجوری سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی مگر ایسی مزے کی باتیں ہوئیں کہ معلوم ہوتا تھا ہم لوگ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ ہمارے دفتر میں جو سکریٹری تھیں ان کا نام جوڈی تھا۔ ویسے یہ نام امریکہ میں بہت عام ہے۔ انھیں میری طرح زکام کی شکایت رہتی تھی اور بال پین کے بجائے فاؤنٹین پین سے لکھنا پسند کرتی تھیں میں ایک دفعہ دفتر میں دوستانی مانگنے گیا تو بہت خوش ہوگئیں اور پھر ان سے دوستی ہوگئی یہ مجھے بہت سے ہندوستانیوں سے زیادہ ہندوستانی نظر آئیں۔ چلتے وقت ملنے آئیں تو بے تکلف بغل گیر ہوئیں اور دائیں گال پر بوسہ دیا۔ یہی عمل کچھ دیر بعد دوسری سکریٹری باربرا نے دہرایا۔ معلوم ہوا کہ بے تکلفی میں یہ معصوم اظہار عام ہے۔ میڈیسن میں جوزف ریڈ گا اور پروفیسر رابنسن اس طرح ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ کینٹ ول اسٹھوے تو خیر پہلے سے ملاقات تھی، مگر پروفیسر شمل سے جب میں نے بوسٹن کی عظمت کا تذکرہ کیا تو کہنے لگیں کہ سرور صاحب آیئے معاملہ ہو جائے نیو انگلینڈ کا سارا علاقہ آپ کے حوالے، آپ قطب مینار ہمیں دے دیجئے میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور میں نے کہا یہ سودا مہنگا ہے۔ پروفیسر شمل بڑی دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ انھوں نے مجھے بڑا اچھا کھانا کلب میں کھلایا اور گھر پر بڑی اچھی چائے پلائی۔ اس چائے اور چائے پر باتوں کا مزا اب تک یاد ہے اور ان کا رسالہ فکر و فن جو ہو دمن جمیل و لباس حریر کے مصداق ہے۔ فلاڈلفیا میں مارس ڈیمو میرے میزبانوں میں تھے۔ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس کا وقت نہ نکال سکا مگر ان کا اردو ادب سے شغف دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اردو کے پروانے امریکہ میں بھی مل جاتے ہیں یہ سہ گرنہ چینیاں احرام دگی خفتہ در بطحیٰ۔ والی بات ہے۔

محمد انصار اللہ

دیوان غالب کا نو دریافت مخطوطہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

زمانۂ کتابت کے تعین کی بنیاد

ایک صفحے پر درج ذیل یادداشت ملتی ہے جسے اس دیوان کی کتابت کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

"لعل خاں بتاریخ اول صفر ۱۲۳۵ھ درماہہ عہ ۸ ؍ "

کہا گیا ہے کہ یہ یادداشت" خود، غالب کے قلم کی ہے۔ اسی طرح متن اور متن کی اصلاحوں کو بھی بخط غالب تسلیم کیا گیا البتہ حاشیہ پر مندرج غزلوں کی بابت متفقہ طور پر کئی صاحبوں نے یہ حکم لگایا ہے کہ وہ بخط غالب نہیں ہیں بلکہ "بخط غیر" ہیں چونکہ یادداشت ۱۲۳۵ھ کی ہے یقین کیا گیا کہ متن کی کتابت اور نظر ثانی اس سال سے پہلے ہوئی ۱۲۳۵ھ سے پہلے چودہ رجب روز شنبہ کے دن از روئے تقویم ۱۲۳۱ھ کو تھی چنانچہ مشہور محقق اور ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے یہ فرمایا:

"لہٰذا ہم باطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسخہ مذکور میرزا صاحب نے شنبہ ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔"

راقم الحروف نے اس یادداشت کی بابت یہ عرض کیا تھا کہ "یادداشت کی بابت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی باتیں شامل ہوتی ہیں۔ آئندہ کے پروگرام، ماضی کی یادیں، حال کے واقعات سبھی کچھ یادداشت کی ذیل میں آجاتے ہیں، بزرگوں سے سنی ہوئی باتیں، کتابوں اور بیاضوں میں محفوظ تحریریں، آنکھوں دیکھی واردداتیں قلمبند کر لی جائیں تو یہ سب یادداشت کی ذیل میں آجائیں گی یادداشت میں عموماً اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ تفصیل مذکور ہونا ضروری نہیں، ان اشاروں کا تا وقتیکہ دوسرے شواہد موجود نہ ہوں سمجھ لیا جانا بھی آسان نہیں ایسی صورت میں کسی یادداشت پر اعتماد کر کے نسخہ کے زمانۂ و سال کا تعین کر لینا مناسب نہیں۔۔۔۔۔ اس مختصر سی تحریر سے یہ مطلب نکال لینا کہ لال خاں نامی کسی شخص کو مرزا غالب نے پہلی صفر ۱۲۳۵ھ کو ملازم رکھا تھا تا وقتیکہ دوسرے ذرائع سے مستحکم ثبوت نہ مل جائے ایک قیاسی بات ہے اور اس قیاس محض کو واقعہ کا درجہ دے دینا صحیح نہیں۔ پہلے تو اس بات کا ثبوت تلاش کرنا ہوگا کہ یہ یادداشت اول صفر ۱۲۳۵ھ ہی کو لکھی گئی تھی اور ایسا نہیں ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ سے نقل کیا گیا ہے یا یہ ماضی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کا زمانۂ مابعد میں ذکر آیا تو اسے محض یادداشت کے طور پر قلمبند کر لیا گیا۔ پھر اگر ایسا ہو بھی تو اس بات کے لئے ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ یہ تحریر خود غالب کے ہاتھ کی ہے۔ محض یہ بات کہ یہ دیوان غالب پر ہے اس کے بخط غالب ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی خصوصاً اس وقت جبکہ اس بات کا بھی اعتراف کیا گیا ہو کہ خود اسی دیوان کے حاشیہ کے اندراجات "بخط غیر" ہیں۔ یادداشت

ڈاکٹر عشرت انور

غزل

(شمیم حنفی کی غزل سے بیچین ہو کر)

بے غرض دل کے لئے ہے ہر تمنا اجنبی
واسطے اپنے ہوئی ہے ساری دنیا اجنبی

ذوق فکر و فن میں وہ منظر نیا ہم کو ملا
آشنا بھی اب نظر آتا ہے گویا اجنبی

رات کی تاریکیوں میں ایک پیچیدہ سڑک
سوچ میں پھرتا ہے اس پر ایک تنہا اجنبی

کانٹے کانٹے کی حنابندی اگر قسمت میں ہے
میرے زخموں کو نہیں ہے کوئی کانٹا اجنبی

خون دل سے ہم نے کانٹوں کو بھی سینچا ہے جہاں
عہد گل نا آشنا ہے پتا پتا اجنبی

ہر قدم پر دل تڑپ جانے کے سو ساماں ہیں
کس طرح ممکن ہے اس دنیا میں رہنا اجنبی

کیوں نئی نسلیں نہ ہوں وارفتۂ احساس نو
درد عالم سے ہے انداز تمنا اجنبی

ہم وہی پابندئ عہد وفا کرتے رہے
دوستوں نے گرچہ بن کر ہم کو دیکھا اجنبی

اب کسی صورت روایت کا چلن ممکن نہیں
میں ہی انور ہو گیا ہوں خود سے گویا اجنبی

کا انداز خط معمولی اور معروف ہے اور اس کا بخوبی امکان ہے کہ یہ "بخط غیر" ہی ہو، قیاسات پر واقعات کی بنیاد رکھنا مناسب نہیں ہوتا۔"

(ہماری زبان یکم اگست ۱۹۷۰ء)

میری ان معروضات کی بابت جو کہا گیا وہ یہ ہے:

"۱۲۳۵ھ کی یادداشت کے بارے میں نثار اللہ صاحب نے جو تمہید باندھی ہے وہ بھی زیب داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کے دیوان پر جو ظاہر ہے ان کا ذاتی نسخہ تھا تاریخ کتابت سے اتنے قریب زمانے میں لکھی ہوئی یادداشت کسی دوسرے شخص کی ہو بعید از قیاس ہے۔ اس یادداشت کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعے کے پانچ دس برس بعد نوٹ کی گئی ہوگی اس لئے کہ اس یادداشت کا مفہوم یہ ہے کہ پہلی صفر ۱۲۳۵ ہجری کو ڈھائی روپے ماہوار پر لعل خاں نامی کسی شخص کو ملازم رکھا گیا ظاہر ہے کہ اس یادداشت کا تعلق ماضی بعید سے نہیں ہوسکتا، اس کی تو یہی ایک صورت ہے کہ مذکورہ تاریخ کو ملازم رکھا اور تاریخ نوٹ کرلی تاکہ مہینے کے خاتمے پر تنخواہ کی ادائیگی کے وقت حساب میں غلطی اور کمی بیشی نہ ہوجائے پانچ دس برس قبل کا اگر یہ واقعہ ہوتا تو اس اندراج کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اس یادداشت کے انداز خط میں کوئی بھی ایسی علامت نہیں جس کی وجہ سے بخط غالب ماننے میں ذرا بھی تامل ہو۔"

(ہماری زبان ۲۲ راگست ۱۹۷۰ء)

اس اقتباس میں ایک سے زائد امور محتاج ثبوت ہیں اور ان کی بنیاد محض مفروضات پر ہے چند غور طلب امور یہ ہیں اور ان کا جواب ظاہراً کچھ نہیں ہے:

(۱) کس طرح ظاہر ہے کہ یہ دیوان غالب کا ذاتی نسخہ تھا اگر "ذاتی نسخہ" ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کی کتابت اس کے مالک ہی نے کی ہو مثلاً اس وقت یہ نسخہ جمعیتہ موجودہ حافظ توفیق احمد صاحب کا "ذاتی" ہے، انھوں نے جیسا کہ ان کا قول ہے، اسے خریدا ہے، لکھا نہیں ہے۔

(۲) تاریخ کتابت کا تعین کیونکر ہوا؟ یہ مسئلہ تو خود اسی یادداشت پر منحصر ہے ورنہ غالب کی زندگی میں ۱۴ رجب منگل کے دن آگے کے برسوں میں بھی واقع ہوئی تھی۔

(۳) اس یادداشت کا مفہوم وہی کیوں ہے جو بیان کیا جارہا ہے؟ اس کے سوا کچھ اور کیوں نہیں ہوسکتا؟

(۴) کس طرح ثابت ہوا کہ لعل خاں کو غالب ہی نے نوکر رکھا تھا، یہ بات تو یادداشت میں ہرگز مذکور نہیں۔

(۵) یادداشت میں کون سی علامت ایسی موجود ہے جو اسے بخط غالب ثابت کرتی ہو؟

قیاسی امور کو مفروضات کی کمک سے واقعات میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ مفروضات اتنے ہی بے ثبات ہیں جتنی ریت کی دیوار، میری معروضات میں اس یادداشت کی بابت پروفیسر گیان چند نے جو لکھا ہے، یہ ہے:

"آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ لعل خاں والی یادداشت لازماً یکم صفر ۱۲۳۵ھ کی تحریر نہیں، بعد کی بھی ہوسکتی ہے۔ اس یادداشت کا انداز متن کی کتابت جیسا نہیں بلکہ حاشیہ پر درج غزل جیسا ہے۔ اگر وہ غالب کے ہاتھ کی نہیں تو یادداشت بھی غالب کے ہاتھ کی نہیں آپ نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اس یادداشت کا انداز اور قلم کے قط کی چوڑائی متن کی اصلاح کے قلم کے قط سے زیادہ چوڑی ہے۔

عرشی صاحب نے یہ جو طے کرلیا کہ لعل خاں غالب کے ملازم تھے یہ بھی کہاں یقینی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ شخص غالب کے کسی ملازم کا عزیز ہو اور کسی دوسرے کے یہاں اس کی تقرری کی بات یادداشت کے طور پر ضبط کرلی ہو یا غالب ہی کا کوئی دور کا عزیز ہو یا کسی دوست کا عزیز ہو یا پڑوسی ہو، اس نے کسی دوسری جگہ ملازمت کی ہو ...... بہرحال اس یادداشت کی بنا پر مخطوطے کی آخری تاریخ کتابت کو ۱۲۳۵ھ طے کرنا صحیح نہیں۔"

(مکتوب بنام راقم مورخہ ۱۱ راگست ۱۹۷۰ء)

اب اگر پروفیسر گیان چند کی رائے کو دوسروں کی رائے سے مطابق کریں تو بات اس طرح بنے گی کہ چونکہ حاشیہ کی کتابت "بخط غیر" ہے اور پروفیسر موصوف کے نزدیک اسی نے "یادداشت" لکھی ہے اس لئے یہ بھی "بخط غیر" ہوئی اور اس سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) جیسا کہ اصرار کیا گیا ہے متن اور یادداشت کا کاتب ایک ہی شخص ہے اس لئے متن کی کتابت بھی "بخط غیر" ہی ہے۔

(۲) "بخط غیر" ہونے کے سبب اس یادداشت کی بنیاد پر مخطوطے کی کتابت یا اصلاح (جس کو بخط غالب سمجھا گیا تھا) کا زمانہ متعین کرنا غلط ہوگا۔

یہ بات کہ مخطوطے کی کتابت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ یا ۱۲۳۲ھ

یقینی ہے پروفیسر موصوف کے اس بیان کے بعد خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیوان غالب کے اس نسخے کی اہمیت یہ نسخہ "اقدم" بھی ہے جتاتے ہوئے لکھا ہے:

"اس دیوان کے اتمام کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے ۱۹ برس کی ہوگی۔ دیوان کی غزلوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں خاص مقامات پر شاعر کا تخیل کتنا گہرا اور طرز ادا کتنی دلآویز اور پختہ ہے۔ اگر حمیدیہ گم نہ ہوا ہوتا، تب بھی یہ نسخہ اس لئے قابل قدر تسلیم کیا جاتا کہ یہ اقدم بھی تھا اور خود بقلم شاعر بھی لیکن اب تو صرف یہی نسخہ ہے جو ہر لحاظ سے بے بہا اور نایاب ہے"

(آجکل دہلی، جولائی ۱۹۶۹ء)

یہ اقتباس اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں کئی قابل لحاظ امور کا بیان کیا گیا ہے:

(۱) اس میں مندرج کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے مولانا کو "حیرت" ہوئی کہ انیس سال کی عمر میں یہ اشعار کیونکر کہے گئے ہوں گے۔ اس "حیرت" کے باوجود معاملہ کی نوعیت پر غور کرنے کے بجائے اس کی تاویل کی گئی۔ اس موقع پر یہ نکتہ ذہن میں رکھنا مناسب ہے کہ غالب بہر حال اسی دنیائے آب و گل سے متعلق تھے۔ ان کی عظمت، ان کی برتری اسی لئے ہے کہ وہ انسان تھے۔

(۲) نسخہ حمیدیہ کا ذکر محض اس نسخے کو اہم تر ثابت کرنے کے لئے کیا گیا ہے حالانکہ اس کی اہمیت کے دونوں سبب یعنی بخط شاعر ہونا اور اقدم ہونا محتاج ثبوت ہیں جیسا کہ عرض کیا گیا۔

(۳) نسخہ حمیدیہ کے ذکر کے باوجود یہ زحمت نہ کی گئی کہ اس سے اس نودریافت نسخے کے متن کا مقابلہ کر لیا جاتا۔ یہ مقابلہ اس کی قدامت کے مفروضہ کی شکست کے لئے کافی تھا۔

نسخہ حمیدیہ کی بابت ہمیں معلوم ہے کہ اس کی کتابت حافظ معین الدین نے ۱۲۳۷ھ میں کی۔ اس کے بعد کسی زمانے میں یہ نسخہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے پاس "تصحیح و ترمیم" کے لئے بھی گیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ چند بار ایسا ہوا لیکن قاضی عبد الودود صاحب نے فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ سے زائد اس کے مرزا کی نگاہ سے گزرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا بہر حال اتنی بات تسلیم کی گئی ہے کہ اس پر اصلاحیں خود مرزا کے ہاتھ کی ہیں اور ان اصلاحوں کا زمانہ یقینی طور پر ۱۲۳۷ھ کے بعد کا ہے۔

نودریافت نسخے میں متن عام طور پر وہی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں ہے۔ دونوں میں قابل ذکر حد تک مطابقت ہے لیکن کاملاً نہیں ہے۔ یہ مطابقت اس بات کی مظہر ہے کہ ایک کی تدوین کے وقت دوسرا وجود میں آچکا ہوگا۔ اختلافات کی موجودگی اس حقیقت پر دال ہے کہ ایک کے مدون کے پیش نظر دوسرا نسخہ نہ رہا ہوگا۔

ایسی صورت میں کسی ایک کا مختصر یا ضخیم تر ہونا لازماً اس کی قدامت کی دلیل نہیں ہو سکتی دونوں کے فرق پر غور کرنا ہوگا۔ نسخہ حمیدیہ میں ایک مطلع یہ ہے ؎

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

نودریافت نسخے میں اس غزل کے شروع میں ایک مطلع لکھا ہوا تھا جسے بعد میں اس طرح کاٹ دیا گیا کہ اب اس کا پڑھ لیا جانا ممکن نہیں۔ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ قلمزد مطلع وہی ہوگا جو اوپر لکھا گیا یعنی نودریافت نسخے کی کتابت کے وقت تک مطلع مذکور غالب کے مستند کلام میں شامل تھا۔ بعد کے کسی زمانے میں کسی سبب سے اس کو قلمزد کیا گیا۔ یہ واقعہ نسخہ حمیدیہ کی اصلاحوں کے بعد کا ہونا چاہئے اس لئے کہ اگر جیسا کہ مشہور ہے نودریافت نسخے میں اس کو خود مرزا نے ہی قلمزد کر کے اپنے کلام سے خارج کر دیا تھا تو زمانۂ مابعد میں اس کے پھر نسخہ حمیدیہ میں لکھے جانے اور خود مرزا کی "اصلاح و ترمیم" کے بعد بھی اس کے قائم و باقی رہ جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔

نسخہ حمیدیہ میں اشعار کا جو متن مندرج ہے وہ ہے جو غالب کی نظر سے اس کے گزرنے کے وقت تک خود شاعر کی نگاہ میں اس کے کلام کی آخری اور قطعی صورت تھی اس میں جو بھی ترمیم ہوئی ہوگی لازم ہے کہ بعد ہی میں ہوئی ہو۔ اس سلسلے میں صرف ایک شہادت بھی مسئلہ کو طے کر دینے کے لئے کافی ہے چنانچہ ایک مقطع نسخہ حمیدیہ میں اس طرح لکھا ہوا ہے ؎

اسدؔ کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہے نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

نودریافت نسخے میں ابتداءً یہ مقطع اسی طرح لکھا ہوا تھا بعد میں کاٹ کر پہلے مصرع کو اس طرح بنایا گیا۔

؎ اسدؔ کو بت پرستی عالم درد آشنائی ہے

اور اس ترمیم یا اصلاح سے نسخہ حمیدیہ محروم ہے۔ اگر یہ مان لیں کہ نودریافت نسخے کی اصلاحیں بخط غالب ہیں تو کم از کم اس ترمیم کا زمانہ نسخہ حمیدیہ کی اصلاحوں کے بعد کا ہوگا۔

نسخہ حمیدیہ میں ایک اور شعر اس طرح لکھا ہوا ہے ...

آئینہ خانہ ہے صحن چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بے خود وارفتہ و حیراں گل و صبح

نو دریافت نسخے میں بھی اصلاً ایسا ہی لکھا ہوا تھا بعد میں "یکسر" کو "یکدست" بنا کر مصرعہ اولیٰ میں ترمیم کی گئی۔ یہ اصلاح بھی زمانۂ مابعد سے متعلق ہونے کے سبب نسخۂ حمیدیہ میں شامل نہیں ہو سکی۔

(یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ کیا غالب نے اپنے اشعار میں یہ اصلاحیں واقعی کی تھیں؟)

ایک مقطع نسخۂ حمیدیہ میں اس طرح لکھا ہوا تھا ؎

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمع کافوری
خدایا اس قدر بزم اسدؔ گرم تماشا ہو

نو دریافت نسخے میں بھی یہ مقطع ابتداءً اسی طرح لکھا ہوا تھا بعد میں مصرع ثانی کو کاٹ کر اس طرح بنا یا گیا۔

؎ خدایا بزم غالبؔ اس قدر گرم تماشا ہو

یہ اصلاح تو تخلص کی تبدیلی کے سبب بادی النظر میں بھی زمانۂ مابعد کی ہے۔ ان صریح مثالوں کے بعد نو دریافت نسخے کو "اقدم" کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کی اصلاحیں تو لازماً نسخہ حمیدیہ کی اصلاحوں کے بعد کی ہیں اور متن بھی ظاہر ادہ ہے جو نسخۂ حمیدیہ کی تدوین کے بعد ہمارے سامنے آیا۔ بہر صورت لعل خاں والی یادداشت کی بنیاد پر وضع کردہ اس روایت کی یقینی طور پر تردید ہو جاتی ہے کہ اصلاحوں کا آخری زمانہ ۱۲۳۵ھ ہے اور اگر اس سنہ کی یہ اہمیت نہیں تو ۱۲۳۱ھ کو اس نسخے کا سال کتابت ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

یہ بات کہ نو دریافت نسخے کا کاتب غالب کے سوا کوئی شخص ہے اس طرح بھی سامنے آتی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ[۱] میں ایک مصرعہ اس طرح لکھا ہے۔

؎ بار ہا بخون تپیدن و آب روان اشک

نو دریافت نسخے میں یہ مصرعہ جب لکھا گیا تو "طپیدن" طائے حطی سے لکھا گیا جو مرزا کے مسلک کے خلاف ہے۔ ان امور کے پیش نظر قیاس یہ کہتا ہے کہ نو دریافت نسخے کا مدون یا کاتب کوئی ایسا شخص ہے جو غالب کے کلام کی فراہمی کی کوشش تو کرتا ہے لیکن اس کے وسائل اتنے نہیں کہ براہ راست مرزا سے یا ان کے "باخبر" تلامذہ سے استفادہ کر سکتا چنانچہ باوجود کوشش کے اسے بہت کم کلام فراہم ہو سکا اور اسی کوشش میں اسے دھوکا بھی ہوا اور اس نے ایک دوسرے شاعر کی غزل بھی داخل دیوان کر دی ظاہر ہے یہ وہ بات ہے جو غالب کے احباب و تلامذہ سے عام طور پر متوقع نہیں بلکہ یہ امر زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس نسخے کے کاتب یا مدون کا مسکن مرزا کے مسکن سے دور بھی ہو۔

کاتب غیر موزوں طبع رہے:

اس گفتگو کے بعد دیکھنا چاہیے کہ کاتب کس استعداد کا مالک ہے اور کیا ایسی استعداد کے مالک کی بابت یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب تھا اس سلسلے میں سب سے پہلی لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس دیوان میں کئی مصرعے ناموزوں لکھے ہوئے ہیں مثلاً

؎ پارۂ جگر کے بھی دل میں تو ہو کر غبار حیف
؎ ہمیشہ مجھ کو طفلی میں مشق تیرہ روزی تھی
؎ بیضۂ آسا ننگ بال و پر ہے کنج قفس
؎ شام غم سوز عشق شعلہ دیاں ہے
؎ کسوت ایجاد بلبل خار نغمہ ہے
؎ دیدہ کو خوں ہو تماشا چمن مطلب تھا
؎ خط نوخیز کے آئینے میں کس نے آرائش
؎ چیں امتداد نامہ خط کا ہو مہر خط سے

ان سبھی مصرعوں میں کوئی لفظ یا تو کتابت میں چھوٹ گیا ہے یا زائد ہو گیا ہے۔ یہ صورت بظاہر اس سبب سے بھی ہو سکتی ہے کہ کاتب عجلت پسند ہو۔

؎ گھر پر پڑا نہ غیر کے نہ کوئی شرار حیف
؎ حیرت سے رخ دست کے ہیں از بس بیکار

ان دونوں مصرعوں میں الفاظ کی ترتیب بگڑ گئی ہے اور یہ صورت محض سہو قلم نہیں بلکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کاتب نے مصرعے کو موزوں نہیں پڑھا۔ ذیل میں کچھ مصرعے ایسے نقل کیے جاتے ہیں جن میں کسی لفظ کی جگہ کچھ اور لکھ دیا گیا ہے جس سے نہ صرف مصرعہ ناموزوں ہو گیا ہے بلکہ معنی بھی خبط ہو گئے ہیں۔

---

[۱] نسخۂ حمیدیہ کی بابت قاضی عبد الودود صاحب لکھتے ہیں:

"غالب نے ایک خط میں لکھا تھا "ابتدائے فکر سخن میں بیدل اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ الخ"

.... بیدل کا ذکر اس دیوان میں بہت جگہ ہے لیکن اسیر و شوکت کا نام تک نہیں آیا"

(معاصر حصہ ۱۲ صفحہ ۲)

نو دریافت نسخے کی بابت زبیدہ انجم صاحبہ (لکھنؤ) کا یہ کہنا اس قول کی روشنی میں واقعی قابل لحاظ ہے کہ:

"اگر یہ دیوان غالب کا ابتدائی دیوان ہوتا تو اس میں اسیر و شوکت کا بھی کہیں نہ کہیں ذکر ضرور ہوتا"

(ہماری زبان یکم اکتوبر ۱۹۷۵ء)

ع اس گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگام وداع
(ذکر "وداع")

ع دوران ساغر ہے گردش ساغر ہے متصل

ع زخم دوزی جرم دیر ابن وزدیدن منع ہے

یہ تمام صورتیں بالخصوص اس لئے زیادہ اہم ہو جاتی ہیں کہ نظر ثانی کے باوجود کاتب نے ان کی تصحیح نہیں کی۔ کسی بھی ایسے شخص سے جو موزوں طبع ہو اس کی توقع عام حالات میں نہیں کی جاتی کہ وہ اس نوعیت کی غلطیوں کو نظر ثانی میں بھی نظر انداز کر جائے گا۔ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس دیوان میں کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں کہ نظر ثانی کے بعد صحیح لکھا ہوا مصرع ناموزوں ہو گیا شلاً ایک مصرع ابتداءً اس طرح لکھا ہوا تھا۔

ع اگر گل بر قد شمشاد پیراہن نہ ہو جاوے

نظر ثانی سے ذرا پاکر یہ اس طرح ہو گیا۔

ع اگر گل سرو کے قامت پیراہن نہ ہو جاوے

لفظ "پیرا" یا "میں" کتابت میں چھوٹ گیا۔ اسی طرح ایک مصرع جو ابتداءً کچھ اور تھا نظر ثانی میں اصلاح پاکر اس طرح بنا۔

ع نہ ہو ماؤں غالب ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے

اس میں ظاہر ہے کہ دوسرا "ہو" زائد ہے۔ اسے قلمزد نہیں کیا گیا۔ یہ مثالیں بہ ظاہر اس بات کی دلیل ہیں کہ کاتب نہ صرف موزوں طبع نہیں بلکہ زبان و بیان کے سقم کو بھی محسوس نہیں کرتا اس سلسلے میں ذیل کا شعر بھی قابل لحاظ ہے ؎

پھر حلقہ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں
جوں دود فراہم ہوئی روزن میں نگاہیں

پہلے مصرع میں 'پڑیں' دوسرے میں 'ہوئیں' ہونا چاہئے تھا۔

کاتب کم سواد بھی ہے،

کہا جا چکا ہے کہ اس دیوان کے مندرجات کی بابت یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ حاشیہ پر مندرج غزلوں کا کاتب 'غالب' نہیں کوئی اور ہے اور یہ بات اس بنیاد پر کہی گئی ہے کہ

" ان غزلوں میں متعدد غلطیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے ناقل کی کم سوادی بتاتی ہیں "

اور اس سلسلے میں میرے یکم راگست ۱۹۷۰ء کے مضمون کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

" جائزہ نگار کا یہ فرمانا غلط ہے کہ میں نے حاشیہ نگار کی کم سوادی کی کوئی مثال نہیں دی میں نے اس کے املا کی ایک فاحش غلطی کا ذکر کیا تھا یعنی یہ کہ اس نے 'تہیہ' کو 'تحیہ' لکھا ہے "

یعنی یہ کہ یہ ایک غلطی اتنی 'فاحش' ہے کہ کاتب کی کم سوادی اس سے ثابت ہو جاتی ہے اور یہ کم سوادی بھی اس درجے کی ہے کہ یہ اس حقیقت کا قطعی ثبوت ہے کہ کاتب غالب یقیناً نہیں ہے کوئی اور شخص ہے۔ بالکل اسی نوعیت کی ایک غلطی کی متن میں بھی نشاندہی کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی اس کی تاویل بھی کر دی گئی ہے یعنی:

" تعالیٰ کو تعالا لکھا ہے اور یہ ...... مثال تو ان کی عربی سے ناواقفیت کی بھی دلیل ہے۔ اگر عربی سے غالب اتنے ہی ناواقف تھے تو 'تہیہ' کو 'تحیہ' بھی لکھ سکتے تھے اور اس کو بڑی اہم فاحش غلطی قرار دینا مناسب نہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ مرزا غالب کی تحریروں میں جو (۱۲۴۵ھ کے بعد کی ہیں) تعالیٰ یا تعالے لکھا ہوا ملتا ہے، 'تعالا' بھی غالب نے کبھی لکھا تھا یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔

املا کی فاحش غلطیوں کی مثالیں دیوان کے متن میں اور بھی مل سکتی ہیں شلاً

ع کوچہ موج کو خمیازہ ساحل باندھا

ع ترے سرو رعنا سے یک قد آدم

ساحل کو ہائے دوچشمی سے اور رعنا کے آخر میں نون کا اضافہ کاتب کی کم سوادی کے لئے کافی ثبوت ہیں۔

اس کے علاوہ بعض اور غلطیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے شلاً

"کلمہ ناٹ پاکو کسا نتہا لکھ دیا ہے ...... ایک سے زاید جگہ پر ...... عدد کی عین اور شتاط کی میم پر پیش لگایا ہے حالانکہ دونوں مفتوح اول ہیں" (نقوش بیاض غالب، صفحہ)

اسی سلسلے میں یہ مصرع بھی دیکھا جائے

ع خونابہ بلا بل حسرت چشیدہ ہوں

'خونابہ' کے ایک نون کا حذف قابل لحاظ ہے۔

یکم راگست ۱۹۷۰ء کے ہماری زبان میں املا سے بحث کرتے ہوئے میں نے یہ مصرعہ بھی پیش کیا تھا۔

ع بیابانے دیدہ آبو کف سیلاب ہو جاوے

اور عرض کیا تھا کہ کاتب نے 'بیابان' میں اضافت کی جگہ یائے مجہول لکھ دی ہے اس بابت بھی کہا گیا کہ

" جائزہ نگار نے متن دیوان سے متعلق جو املائی غلطیاں گنائی ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ انھوں نے خط شکست اور غالب کے خط دونوں کے املا پر غور نہیں کیا " (باقی صفحہ ۱۱ پر)

لہ نقوش لاہور کا غالب نمبر جو "بیاض غالب بخط غالب" کے نام سے شائع ہوا محب گرامی حکیم ظل الرحمان صاحب کی عنایت سے چند روز کے لئے مل گیا تھا اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

مراسلات

دیوانِ غالب بخطِ غالب کے متعلق

ہماری زبان کا ۱۵ ستمبر کا شمارہ دیکھا۔ گزشتہ یکم اگست اور ۲۲ اگست کے پرچے بھی دیکھے تھے۔ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ ہم مسائل پر علمی انداز سے غور و فکر کرنے کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ جہاں ہم کو کسی نے کسی مشہور نام سے منسوب کر کے کوئی نئی چیز دکھا دی ہم فوراً اس کی تشہیر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ تمام تماشہ دیوانِ غالب بخطِ غالب کی بابت شروع میں ہی کیا گیا تھا کہ اس کی بابت ماہرین کی رائیں طلب کی جائیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے قاضی عبدالودود صاحب کی کوئی تحریر اس بابت نہیں چھپی۔ ہمارے ارباب حل و عقد اپنے طور پر کاغذ سیاہ کرتے رہے اور شعبدہ دکھلاتے رہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے اس جعل کا پردہ چاک کر کے نہ صرف دنیائے ادب پر احسان کیا ہے بلکہ انھوں نے ہمیں پہلی بار یہ بھی بتایا ہے کہ مخطوطات کے ظاہر پر اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوتا۔ املا اور حروف کی ساخت وغیرہ پر بھی غور کرنا واجب ہے۔ اس اصول پر ہمیں اپنے تمام مخطوطات کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہئے۔

دہلی ● محمود آفاق ایم۔اے

(۲)

ڈاکٹر انصار اللہ کے مضامین بہ سلسلہ "نودریافت دیوانِ غالب" جو یکم اگست ۱۹۷۰ء اور یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء کے شمارہ "ہماری زبان" میں شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نسخہ زیرِ بحث نہ تو نسخہ حمیدیہ سے پرانا ہے اور نہ غالب کا "خود نقل کردہ" ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے جو ٹھوس دلائل و براہین پیش کئے ہیں وہ محض قیاس و مفروضات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس حقائق کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔ اس طرح موصوف کے غائر مطالعہ ادبی شعور بلند تنقیدی اور تحقیقی نظریہ کی روشنی میں ان کی شخصیت کا اعتراف بھی ضروری ہے۔

گورکھپور مقبول حسین

پھر وہی لکھاوٹ کی بات

مندرجہ بالا عنوان کے تحت یکم ستمبر ۱۹۷۰ء کے "ہماری زبان" میں جناب اقبال کرشن نے بالکل سچ کہا ہے کہ دوسری زبان والے تو اپنی زبان کی ٹھوس خدمات انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور ہم اردو والے رسم خط کی فضول بحث میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ رسم خط بدلنے کا مشورہ صرف اردو والوں کو دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اور بھی کئی زبانیں ہیں آخر یہ مشورہ انھیں کیوں نہیں دیا جاتا؟ دیوناگری رسم خط کا پرچار کرنے والے ذرا تامل، تلگو اور پنجابی زبان والوں کو یہی مشورہ دیں اور پھر دیکھیں کہ انھیں اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ دیوناگری رسم خط کے ان فریفتگان سے ہماری درخواست ہے کہ اگر وہ اردو کے لئے کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کو برباد کرنے کی کوشش تو نہ کریں۔

اقبال کرشن صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ اردو کے دشمنوں کو پہچاننے کا یہی ایک مجرب نسخہ ہے۔

حیدرآباد ● سری نواس لاہوٹی

شعبۂ اردو، گورکھپور یونی ورسٹی میں حالیہ ریفریشر کورس کے متعلق

شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والا پہلا ادبی بلیٹن نظر سے گزرا، جو تمام تر اس ریفریشر کورس کی روداد پر مشتمل تھا جس کی تفصیلات بہت پہلے دہلی، اترپردیش اور بہار کے متعدد اخبارات میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ اب اسی کارروائی کو مزید تشہیر کے لئے علیحدہ بلیٹن کے ذریعہ مشتہر کیا گیا ہے اور اسے تمام یونی ورسٹیوں اور علمی ادبی اداروں اور بعض کچھ غیر متعلقہ حلقوں میں بلاقیمت بھیجا گیا ہے۔

میں موسم گرما کے اس تربیتی نصاب اور اس کے پروگرام کے متعلق نہایت خلوص سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہندوستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، اساتذہ کی کل تعداد ڈیڑھ دو سو سے زیادہ نہیں ہے اور اس سے چوگنی تعداد ان امیدواروں کی ہے جو پوسٹ گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ پی۔ایچ۔ڈی بھی ہیں اور کسی یونی ورسٹی میں بحیثیت استاد کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں مگر ان کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر ۵۰، ۷۵، ۱۰۰ اور ۱۲۵، ۱۵۰ وغیرہ ہیں۔

جو اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں یونیورسٹیوں نے ان کی تدریسی اہلیت دیکھ کر ہی ان کو منتخب کیا ہے اور ان میں اکثر و بیشتر اچھے استاد ہیں۔ میں شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی کے اراکین سے مودبانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت سب سے اہم ضرورت اردو کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی ہے۔ اگر آپ درخت کی چوٹی پر پہنچ چکے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جڑ کی کمزوری اور شاخوں کی خشکی سے بے خبر ہوں جب

جڑیں کٹ رہی ہوں یا ان میں دیمک لگ چلی ہو تو ہر آن درخت کے گرنے کا خطرہ رہتا ہے اور خدانخواستہ درخت گرا تو آپ بھی اس بلندی سے نیچے آجائیں گے۔ اگر اردو اساتذہ کو ایام تعطیلات میں یکجا کرکے اردو پڑھنے والے طلبہ کے لئے بنیادی تعلیم کے اسکول قائم کرنے کا کوئی پروگرام بناکر اس کے لئے عملی اقدامات کرتے یا کسی ایک علاقہ کو منتخب کرکے اس میں اردو پڑھنے والوں کی دشواریوں کی جانچ کرکے ان کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی جدوجہد کی جاتی یا پھر پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ کے لئے تربیتی کیمپ قائم کرتے جس میں ان کو جدید طرز پر اردو کی تدریس کے طریقے سکھانے کی کوشش ہوتی تو یہ ایک اہم خدمت تھی، اور انھیں چیزوں کی اس وقت ضرورت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے ۱۰۰۵ سے رقم نہ ملتی مگر کام کرنے والوں کا ضمیر مطمئن ہوتا اور ان کو مسرت محسوس ہوتی کیونکہ ان کے ہاتھوں وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی اور ان کا کام دوسرے ہمدردان اردو کے لئے ایک نمونۂ عمل بنتا۔

مختلف اصناف ادب پر تقاریر کا انتظام اور مباحثہ اتنا سودمند نہیں جتنا مذکورہ کاموں پر توجہ دینا مفید ہے۔ تدریسی اصول وضوابط پر کتابیں موجود ہیں ان کا مطالعہ اساتذہ کے لئے وقتی اور ہنگامی تقاریر سے زیادہ مفید ہے۔ پھر یونیورسٹیوں کے نئے اساتذہ بھی ان چیزوں سے کافی واقفیت کے بعد اس منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ ٹریننگ تو ابتدائی مدارس ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں کے اساتذہ کے لئے ضروری ہوتی ہے اسی لئے حکومت نے انھیں کا انتظام کر رکھا ہے گورکھپور یونیورسٹی کے اس اجتماع میں دوسرا اہم کام نصاب تعلیم کی ترتیب وتدوین کے سلسلہ میں ہوا، حالانکہ جامعات ہند کے تمام اساتذہ عموماً اس بات سے واقف ہیں کہ ان کی ایک کل ہند انجمن بھی موجود ہے اور چار سال سے وہ ایک فعال تنظیم کی حیثیت سے سامنے آچکی ہے۔ اس نے تمام یونیورسٹیوں کے لئے یکساں نصاب کی ترتیب وتدوین پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ عملی اقدامات بھی کئے ہیں، انجمن کی کانفرنس منعقدہ دہلی میں اس عنوان پر مقالات بھی پڑھے گئے مباحثے بھی ہوئے جو شائع ہوچکے ہیں پھر کشمیر اور علی گڑھ کی کانفرنسوں میں بھی یہ مسئلہ زیر غور رہا اور جہاں تک مجھے علم ہے بی۔اے کے درجات کے نصاب کی ترتیب وتدوین بھی عمل میں آچکی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ انفرادی طور پر گورکھپور یونیورسٹی کا شعبہ اردو کس سبب سے مشترکہ جماعتی پروگرام سے انحراف کرکے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں مصروف ہے۔

شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے اساتذہ کا اردو کی خدمت کا جذبہ قابل تحسین ہے اور ان کے جذبات کی اہل علم وادب یقیناً قدر کریں گے، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ اگر یہ جوش عمل اور جذبۂ خدمت مناسب طریقہ پر وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تعمیری کاموں میں صرف ہو تو دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔ اردو کی مرجھائی ہوئی جڑوں کی آبیاری وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم اس کے پھولوں اور پھلوں سے محروم ہوجائیں گے۔

دلی　　　● امیر حسن نورانی

یہ شعر کس کا ہے؟

مندرجہ ذیل شعر کس شاعر کا کس کتاب میں ہے جن صاحب کو اس کے متعلق علم ہو بذریعہ ہماری زبان مطلع فرمادیں ؎

بہ بحر تقارب تقرب نما
بدیں وزن میزان طبع آزما

کلکتہ　　　● ایوب رضوی

چند سوال؟

غالب کے سفر کلکتہ سے متعلق "چند" بنیادی باتیں متنازعہ ہی ہوئی ہیں۔ لہذا قارئین "ہماری زبان" سے گذارش ہے کہ وہ ذیل کے چند سوالوں کا جواب ذاتی طور پر یا بذریعہ "ہماری زبان" دیکر شکریہ کا موقع دیں گے۔

س: غالب کی ملاقات، مولوی سراج الدین سے کب اور کہاں ہوئی؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کلکتہ میں ملے تھے!

س: نواب عبد اللطیف (برادر ناسخ) ادیب یا شاعر تھے؟ غالب سے ان کی ملاقات، کب اور کہاں ہوئی؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کلکتہ میں ملے تھے؟

س: ناسخ سے غالب کا تعلق کس نوعیت کا تھا؟

● ایم۔اے نفر
۲۲ براہورن روڈ کلکتہ ۱

اخبار و افکار

یوپی میں اردو زبان کی ہمت افزائی

راجندر نگر: خیال کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے یوپی کے کانگریسی لیڈروں اور جماعتی کارکنوں سے ۴۵ منٹ کی ملاقات میں یوپی کے اندر اردو زبان کی ترقی اور نشو و نما کے لئے مناسب اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے یہ خیال اقلیتی فرقوں کے مسائل پر بحث کے دوران ظاہر کیا۔ جب یہ تجویز رکھی گئی کہ اردو کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا جائے تو وزیر اعظم نے یوپی کے ایک سابق وزیر سے دریافت کیا کہ اس سلسلہ میں اب تک حکومت نے کیا اقدامات کئے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب کے ڈی مالویا اور جناب چندر جیت یادو نے بھی اردو کو بڑھاوا دینے کی تجویز کی زبردست حمایت کی۔ • نیشنل ہیرالڈ

گلبرگہ میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا خیر مقدم

گلبرگہ: ادبی سنگم گلبرگہ کے زیر اہتمام بمقام مسلم ہاسٹل اردو کی ممتاز ادیبہ محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب طیب انصاری صدر ادبی سنگم نے کی۔ سید مجیب الرحمٰن صدر استقبالیہ نے خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جناب عبد الحلیم تماپوری کے طویل انشائیہ 'بربط حیات' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔

بہت سے ممتاز ادیبوں نے بربط حیات پر مضامین سنائے۔ جناب طیب انصاری نے ڈاکٹر صاحبہ کے ادبی، تحقیقی اور علمی کارناموں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ادبی سنگم کے کارکنوں کی ہمت افزائی کرنے پر شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ گلبرگہ کے دوران قیام میں محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے گورنمنٹ کالج گلبرگہ کی بزم اردو کی افتتاحی رسم بھی انجام دی۔ • طیب انصاری

"کاروانِ سیفیہ" کی ماہانہ ادبی نشست

بھوپال: "کاروانِ سیفیہ" کی چوتھی ماہانہ ادبی نشست پروفیسر عبد القوی دسنوی کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ ابتدا میں سلیمان اریب مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر اظہار تاسف کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

جناب متین سید معتمد بزم نے سلیمان اریب کی شخصیت اور فن کے متعلق اپنا مقالہ "لمحوں کا گریز پا مسافر" پڑھا۔

ادبی نشست کے دوسرے دور میں جناب مظفر حنفی، جناب عرشی جعفری، جناب عبد المتین نیاز، جناب ظفر صہبائی اور جناب تصور لطیف نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔

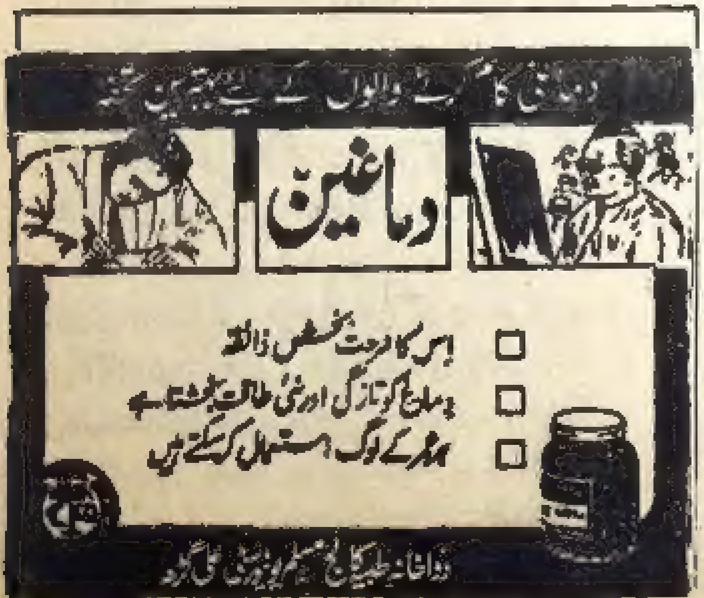
جناب متین سید نے "غالب صدی اور بھوپال" کے عنوان سے تفہیم غالب کے سلسلہ میں بھوپال کے قلمکاروں کے تنقیدی و تحقیقی کارہائے نمایاں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا۔ آئندہ ادبی نشست ۶ دسمبر ۱۹۹۰ء (بروز اتوار) منعقد ہوگی۔

• ناظم نشر و اشاعت

ہریانہ میں پنجابی اور اردو تعلیم کے لئے طلبہ کو سہولتیں

چنڈی گڑھ: حکومت ہریانہ نے اپنی لسانی اقلیتوں کو "خصوصی رعایتیں" دی ہیں تاکہ انھیں ریاست میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے، پنجابی یا اردو پڑھنے کی پوری سہولتیں مل سکیں۔

ریاستی وزیر تعلیم جناب مارو سنگھ نے یہاں ایک پریس کانفرنس میں یہ بات بتاتے ہوئے کہا کہ ریاست نے جو سہ لسانی فارمولا اپنایا ہے اس کے تحت پہلی لازمی زبان اور ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے پہلے پرائمری درجے سے ہندی پڑھائی جاتی ہے چھٹے درجے سے انگریزی دوسری لازمی زبان اور ساتویں اور آٹھویں درجوں



میں سنسکرت پنجابی یا اردو تیسری لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ لسانی اقلیتوں کو جو رعایتیں دی گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ نجی انتظام کے تحت جن اسکولوں میں ۱۹۶۶ء میں پنجاب کی نو تنظیم سے قبل پنجابی زبان ذریعہ تعلیم تھی وہ جوں کی توں رہے گی۔

پہلے پرائمری درجے میں ہندی کے علاوہ اردو اور پنجابی زبانوں کی مزید تعلیم کا بندوبست اس صورت میں کیا جائے گا کہ درجے میں ان زبانوں کو پڑھنے کے لئے ۱۰ طلبہ ہوں یا پرائمری درجوں میں ۴۰ طلبہ ان زبانوں کو پڑھنے کے خواہش مند ہوں۔

• قومی آواز

صفحہ ۱۲ سے آگے

بلکہ تجربے کے اس نادر نقطۂ ارتکاز (POINT OF FOCUS) پر جس میں خیالات اور احساسات موجود بھی ہوتے ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔

میں اکثر یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ جو لوگ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اس لئے منکر ہیں کہ اسلام جیسے ہمہ گیر اور آفاقی نظام اقدار وحیات میں اقبال کے پختہ یقین اور ایمان کو وہ گلے سے نہیں اتار سکتے وہ دانتے، لینگ لینڈ، ملٹن، بلیک اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بڑائی پر کیسے ایمان لے آتے ہیں، جبکہ ان سب شاعروں کا وجدان اور احساس عیسائیت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے؟ دانتے کی (COSMOLOGY) ہی عیسائیت سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ اس کی پوری شخصیت بھی اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لینگ لینڈ کی شہرۂ آفاق نظم PIERS PLOWMAN کا اٹھارواں حصہ جس میں حضرت مسیح کے مصلوب کئے جانے کے واقعہ کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے، نہ صرف اس نظم کا بیت الغزل ہے بلکہ ازمنہ وسطیٰ کی پوری انگریزی شاعری میں اس کا جواب نہیں۔ ملٹن کی نظم فردوس گم گشتہ کو ملٹن کی عدم موافقت (NON-CONFORMISM) کے باوجود عیسائیت سے علیحدہ کر کے کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ بلیک کی معرکتہ الآرا نظم (JERUSALEM) کے بارے میں اپنے مسلسل مطالعے کی بنیاد پر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس پر دسترس اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انجیل مقدس پر عبور حاصل کرنے کے لئے ایک مدت صرف نہ کی گئی ہو اور ایلیٹ کے بارے میں ہر پڑھا لکھا آدمی اتنی بات تو جانتا ہی ہے کہ اس کی شاعری سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عیسائیت سے واقفیت ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سب شاعروں کے یہاں کتنی تلمیحات محاکات اور شعری کردار ایسے ہیں جو براہ راست انجیل مقدس سے مستعار لئے گئے ہیں ان کا اساطیری نظام بھی عیسائیت ہی کی دین ہے۔ اقبال کا اساطیری نظام اسلام سے ماخوذ ہے اور یقیناً ہے۔ ان کے یہاں تلمیحات اصطلاحات اور شعری کردار بھی قرآن حکیم سے لئے گئے ہیں اور یقیناً لئے گئے ہیں۔ ان کی بعض بہترین نظموں کا سیاق و سباق اور ان کی روح بھی اسلامی ہیں اور یقیناً ہیں۔ لیکن جس طرح عیسائیت متاثر ہونا دانتے، لینگ لینڈ، ملٹن، بلیک اور ایلیٹ کی شاعری کے لئے تحدیدی عنصر (LIMITING FACTOR) نہیں ہے اسی طرح اقبال کی شاعری کی اپیل بھی اسلامی تعلیمات میں ان کے پختہ اور راسخ ایمان سے ہرگز مجروح نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی سے اس نے بال و پر حاصل کئے ہیں جس طرح ان پانچوں مغربی شاعروں نے عیسائیت کے ڈھانچے کے اندر رہ کر زندگی اور زمانے میں اپنی بصیرت کا اظہار کیا ہے اسی طرح اسلام کا نظام اقدار اقبال کے شعری ادراک کے لئے انگریزی شاعر شیلے کی اصطلاح میں ایک غیر مبدل نقطۂ استناد (FIXED POINT OF REFERENCE) ہے۔ البتہ جہاں اقبال کا تخاطب براہ راست ہے یا جن مقامات پر انھوں نے قرآن حکیم کی آیات یا احادیث کو بجنسہٖ نظم کر دیا ہے، وہ فنی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہے لیکن یہ محض مذہبی عقیدے ہی کا معاملہ نہیں ہے۔ اس اصول کا اطلاق ظلمیانہ اور سیاسی عقائد پر بھی اسی طور پر ہوتا ہے۔ بال جبریل اور زبور عجم کی غزلیں، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، پیام مشرق کی بیشتر نظمیں، بانگ درا اور ضرب کلیم کی بعض نظمیں حتیٰ کہ ارمغان حجاز کے قطعات اور بعض نظمیں بھی شاعری کے بلند سے بلند معیار پر پوری اترتی ہیں کسی ادبی کارنامہ کے اچھے ہونے یا نہ ہونے کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ اس کا موضوع مذہبی ہے یا غیر مذہبی۔ معیار دراصل یہ ہے کہ فکر و احساس کا اچھوتا اور غیر متوقع ارتکاز فنی حسن و تکمیل کے لباس میں جلوہ گر ہو سکا ہے یا نہیں۔ ہماری زبان کے دو ممتاز شاعروں یعنی جوش اور فراق کو جو اقبال کی اسلامی شاعر ہونے پر خود گیری بھی کرتے ہیں لیکن جن کے اعصاب پر اقبال کی عظمت کا آسیب برابر سوار بھی رہا ہے، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ کہ اقبال کے معیار کی شاعری محض خلا میں پرورش نہیں پاتی۔ اقبال کی سطح پر پہنچنے کے لئے اقبال کا سا علم آگہی اور بصیرت قبول ضروری ہیں اور

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

اقبال کی شاعری پر جو مختلف اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے ایک جو بیک وقت تنگ نظری اور کج فہمی پر مبنی ہے، یہ ہے کہ ان کی شاعری کی اپیل اس لئے محدود ہے کہ یہ اسلامی شاعری ہے۔ اس محاکمے (JUDGEMENT) کی تہ میں تین مفروضے ہیں۔ اوّل یہ کہ اسلامی تعلیمات محض عقائد سے عبارت ہیں اور کسی ہمہ گیر آفاقی نظر (VISION) کی حامل نہ ہونے کی وجہ سے ان میں عام انسانیت کے لئے کوئی عالمگیر پیغام نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بھی مذہبی جذبے اور عقیدہ سے جو مذہبی اقدار حیات اور نظم (ORDER) سے مربوط اور منسلک ہے، متاثر ہو کر بڑی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ اور تیسرے یہ کہ بڑی اور اچھی شاعری صرف نامذہبی وابستگی اور ارضی (MUNDANE) موضوعات اور کیفیات ہی سے قوتِ نمو اور قوتِ محرکہ حاصل کر سکتی ہے۔ پہلے مفروضے سے میں سردست بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کم از کم میرے لئے اور بہت سے اصحاب فکر و فہم و دانش کے لئے یہ ایک کھلی ہوئی اور روشن حقیقت ہے کہ ذہن و عمل کے موجودہ خلفشار میں اسلامی تعلیمات کی صداقت، برگزیدگی اور جامعیت ہی سب سے بڑی مشعلِ راہ ہے کیونکہ یہ ایک طرف عقل سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور دوسری جانب ان میں انسانی فطرت کے نشیب و فراز کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے صراطِ مستقیم پر رکھنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ دوسرے مفروضے کے سلسلے میں یہ بات غور طلب ہے کہ ہمیں شعر اور غیر شعر میں تمیز کرنی چاہئے۔ کسی بھی عقیدے کو چاہے وہ مذہبی ہو، سیاسی ہو یا فلسفیانہ ہو، نظم کر دینا ایک بات ہے، اسے شاعرانہ شعور میں سمو کر اور تخلیقی تخیل کے کیمیاوی عمل سے گذار کر حرف و صوت کی پیچیدہ تنظیم میں پیش کرنا قطعی مختلف چیز ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری کے لئے دو شرائط لازمی ہیں، اوّل یہ کہ فن کار کسی بھی نظام اقدار کے اندر اپنے آپ کو گہرے اور شدید طور پر مدغم کر دینے کی ریاضت سے کافی عرصہ تک دوچار ہوا ہو اور دوسرے ترسیل کے دوران وہ شعوری طور سے اس کا احساس نہ رکھتا ہو۔ ان میں سے کوئی ایک شرط اگر پوری نہ ہوئی تو غیر ہضم شدہ مواد سطح پر ظاہر ہو کر اپنی ناپختگی کی طرف پڑھنے والے کی توجہ کو مبذول کرائے گا۔ تیسرے مفروضے کے سلسلے میں یہ امر قابل غور ہے کہ نہ اچھی شاعری کسی ایک رنگ روپ کی پابند ہوتی ہے اور نہ اس کے لئے موضوع کی کوئی قید ہے۔ اچھی شاعری مذہبی جذبے کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور نامذہبی (SECULAR) موضوعات بھی اس کی تخلیق کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ شاعر کے وجود کلی کے بطن سے پیدا ہوئی ہو۔

اقبال کی شاعری پر اگر آپ دیانت داری اور سنجیدگی سے غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ اس کا معیار یکساں نہیں ہے۔ یہ بات کسی بھی زبان کے بڑے سے بڑے فن کار کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ذاتی طور پر میں "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کو بہت اہمیت نہیں دیتا۔ اقبال نے ہنگامی سیاسی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور ان کی بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں، جن میں محض فلسفیانہ افکار یا مذہبی عقائد کو نظم کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ خیالات اور نظریے بدیہی طور پر اس لئے ظاہر ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ شاعر کی شخصیت کی اندرونی تہوں میں جذب ہو کر برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن اقبال کے یہاں اعلیٰ درجے کی چیزیں، ہمارے کسی بھی اردو شاعر کے مقابلے میں، جن میں غالب بھی شامل ہیں، کہیں زیادہ ہیں۔ میں نے کئی جگہ اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے اور میں اس کا پھر اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ادب میں حقیقت پسندی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اپنے آخری تجزیے میں اعلیٰ ادب اور شاعری کے موضوعات مابعد الطبیعاتی موضوعات سے غیر ممیز ہوتے ہیں، اور شاعری میں بڑائی کا عنصر حقیقت کے اس ادراک سے پیدا ہوتا ہے جسے وجود کلی کا ادراک کہہ سکتے ہیں۔ فلسفے اور ادب میں جو شے مابہ الامتیاز ہے، وہ یہ کہ فلسفے میں ہم تمام تر تصورات یعنی (CONCEPTS) سے سروکار رکھتے ہیں، ادب میں حسیاتی شکلوں یعنی (SENSUOUS FORMS) سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور شاعری میں تصورات اپنی حسیاتی شکلوں میں تحلیل ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ تحلیل ہونے کا یہ عمل تخلیقی تخیل کی اس ریاضت یا واگذاشت (RELEASE) پر منحصر اور اس کا پابند ہے۔ جس کے بغیر اچھے ادب کا وجود ممکن نہیں۔ اچھی شاعری کا انحصار نہ محض خیالات اور تصورات پر ہے اور نہ محض جذبات و احساسات پر

(باقی صفحہ " پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD-NO.L. 922 فون نمبر ۲۱ R.NO-2166/57